علّامہ اقبال کے تصوّرات

تحریر : فرقان دانش خان

ہمارے ہاں شاعری ایک رسم و رواج یا ذریعۂ تفریح کی حیثیت رکھتی ہے لیکن علامہ اقبال شاعری کو یہ پست مقام دینے کیلئے تیار نہیں۔ وہ شاعری برائے شعروادب کے قائل نہیں، بلکہ شاعر برائے زندگی ہیں اور فن برائے فن کو نہ صرف خطرناک بلکہ مہلک قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی فکر کے مقابلے میں فن کو کبھی قابل وقعت خیال نہیں کیا۔ ان کے نزدیک اصل اہمیت فکر، پیغام اور تصورات کو حاصل ہے۔ وہ شعر کی عام فنی خصوصیات پر زور دینے کی بجائے خیالات کی بلندی، ندرتِ افکار اور عملِ پیہم کا درس دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اقبال فنی اعتبار سے بھی اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔

شاعر مشرق علامہ اقبال جس دور میں پیدا ہوئے اس وقت ملت اسلامیہ زوال پذیر تھی۔ سلطنت مغلیہ کا سورج غروب ہو چکا تھا اور مسلم حکومتیں یکے بعد دیگرے ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ مسلم قوم تن آسانی کا شکار ہو کر ذلت و رسوائیوں کے عمیق گڑھے میں گر چکی تھی اور اس نے انگریزوں کے پہنائے ہوئے طوقِ غلامی کو اپنا مقدر سمجھ لیا تھا۔ اقبال کے سینے میں ایک درد مند دل تھا جو مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ یہ تڑپ رفتہ رفتہ ناسور بن گئی اور یہ سوز و گداز اور غم و الم ان کی زندگی کا سرمایہ ٹھہرا۔ انہوں نے سوئی ہوئی قوم کو جگانے اور اس کے تن مردہ میں روح پھونکنے کو اپنا مقصد حیات بنا لیا۔ چنانچہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان کی عظمت و مقبولیت کی اصل وجہ ان کی شاعری ہی ہے جس نے مسلم قوم کی مُردہ رگوں میں خون کی حرارت پیدا کرنے کے لئے آبِ حیات کا کام کیا۔ اقبال کی شاعری میں جو چیز سب سے اہم اور اکسیر ہے وہ اقبال کے تصورات اور نظریات ہیں۔ اقبال کے تصورات زندگی کی مثبت حقیقتوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو ایک مؤمن اور مسلم معاشرے میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال کی شاعری کے چند تصورات کا مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ آج ہماری زندگیوں میں پھر وہی انقلاب برپا ہو سکے جو قیام پاکستان سے پہلے مسلمانانِ ہند کی زندگیوں

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

میں اقبال کی شاعری کی بدولت رونما ہوا تھا۔

اقبال کا تصورِ حیات

اقبال کی شاعری میں "تصورِ حیات" زندگی کی ایک مثبت حقیقت کے طور پر اجاگر ہوتا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ زندگی کی جملہ کثافتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ علامہ اقبال نے جو فلسفہ حیات پیش کیا ہے اس کے لئے محسن انسانیت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سادہ زندگی کو مثال کے طور پر پیش نظر رکھا ہے۔

علامہ اقبال اپنے تصورِ حیات میں قاری کو زندگی سے فرار کی تعلیم نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک افضل یہ ہے کہ آدمی نہ صرف جہان سے متعلق رہے، بلکہ اس کو تسخیر کرنے کی قوت بھی اس میں موجود ہونی چاہئے۔ ان کے نزدیک یہ کائنات ابھی نامکمل ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اس کائنات کے لامحدود خزانوں کی تلاش کرے اور اسے مکمل کرے۔ چنانچہ فرمایا ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں

علامہ اقبال اپنے اس تصور کی وضاحت میں جابجا سخت کوشی اور محنت کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی کا اصل مقصد صرف زندہ رہنا نہیں بلکہ زمانے کے غیر موافق حالات کو بدل کر انہیں اپنی ضروریات کے مطابق بنانا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ جدوجہد اور محنت زندگی کو رواں دواں رکھنے کا ذریعہ اور زندگی کا اصل مقصد ہے اور یہی جذبہ انسان کو صحابہ کرامؓ کی طرح زمانہ ساز بنا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال محنت اور جدوجہد کے ضمن میں یقین محکم اور عمل پیہم کی تلقین کرتے ہوئے زندگی کی حقیقت بتاتے ہیں ؎

زندگانی کی حقیقت کوہ کَن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں

شاعر مشرق نے ہمیں حرکت و عمل کا جو تصور حیات دیا ہے، وہ نہایت وسیع ہے اور اقبال

© rasailojaraid.com

کی شاعری کے جن تصورات کی آگے تشریح کی جا رہی ہے وہ بیک وقت اقبال کے تصورِ حیات میں کار فرما ہیں۔

اقبال کا مَردِ مؤمن

اقبال کا مَردِ مؤمن وہ کامل انسان ہے جسے ہر زمانے میں پانے کی خواہش کی گئی ہے اور جس کے کردار کے خاکے کئی مفکرین نے پیش کئے۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال کا مَردِ مؤمن ایک جرمن فلاسفر نطشے کے تخلیق کردہ کردار سُپرمین (super man) سے ماخوذ ہے' لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیونکہ نطشے کا سپرمین جنگ عظیم میں انسانی تباہ کاریوں کے ردعمل کے طور پر محض ایک تصوراتی کردار ہے' جو صرف اور صرف جسمانی طاقت و قوت کا مظہر ہے اور فراست و تکبر اس کے اعلیٰ ترین جوہر ہیں۔ گویا نطشے کا سپرمین انتہا پسندی' سیاسی اقتدار اور نسلی امتیاز کی پیداوار ہے اور ہر قسم کی اخلاقی اقدار کی نفی کرتا ہے۔ جبکہ اقبال کے ہاں یہ تصور بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے مَردِ مومن کو قرآنی آیات کے سانچے میں ڈھال کر اسے کردارِ محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کا پرتو دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان کا مَردِ مؤمن جہاں مادی دنیا کی بڑی سے بڑی قوت کو تسخیر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے' وہاں اپنے زورِ بازو سے حاصل شدہ چیز کو دوسروں کی خدمت اور بھلائی کیلئے وقف کر دینے کی صفت بھی رکھتا ہے۔ اقبال مؤمن کی تعریف میں رقم طراز ہیں ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

یہ وہ مقام ہے جہاں اس مَردِ کامل کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ اسی تصور کو اقبال نے نہایت حسین پیرایہ میں اس طرح پیش کیا ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ
غالب و کار آفرین' کار کشا' کار ساز

اقبال کے نزدیک جب مَردِ مؤمن میں خدائی صفات کا پرتو پایا جاتا ہے تو اس میں قہر و غضب اور غفاری و درگزر کی صفات بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ ان عناصر کے بغیر حقیقی مسلمان نہیں بنتا۔ فرمایا ؎

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

لیکن یہاں یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اقبال کا مردِ مؤمن صرف غیظ و غضب کی علامت ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ رحم اور لطف و کرم کی صفات بھی اس میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ علامہ اقبال کے نزدیک ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

اقبال کا مؤمن تند مزاج نہیں ہوتا۔ دنیا کی کوئی بات اس کی نظر میں مشکل نہیں ہوتی۔ زندگی کے حادثات کو وہ صبر و تحمل سے برداشت کرتا ہے۔ وہ کسی کا ممنون احسان ہونا پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک قابل سپہ سالار کی طرح اپنے محدود وسائل کو نہایت دُور اندیشی سے استعمال کرتا ہے۔ اقبال ملائمت، نرم مزاجی اور سخت کوشی کو بھی انسانِ کامل کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ؎

نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اقبال کا مَردِ کامل روح کی اعلیٰ قوتوں کا منبع بھی ہے۔ وہ ایمان و یقین کی بدولت مادہ پر قابو رکھتا ہے۔ اسکے کردار کا جوہر نہایت درخشاں ہے۔ اسکی قوت مادی کائنات کو مسخر کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔ قوموں کی تقدیریں اس کی نگاہوں کے اشارے سے بنتی ہیں ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مَردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!

اقبال کا تصورِ ملت

انگریزی زبان میں ملت یا قوم کے مترادف ایک لفظ نیشن (nation) ہے لیکن انگریزی لفظ نیشن اقبال کے ہاں ملت کا بدل نہیں ہے کیونکہ مغرب کے تصور کے مطابق قوم رنگ، نسل، زبان یا علاقائی درجہ بندی سے ظہور میں آتی ہے جبکہ مسلم ملت میں یہ امتیاز نہیں۔ مسلمان دنیا کے کسی خطے میں رہتا ہو، کوئی زبان بولتا ہو یا کسی بھی رنگ و نسل

© rasailojaraid.

سے تعلق رکھتا ہو' مسلم ملت یا امت کا حصہ ہے اور ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ چنانچہ اقبال کے ہاں ہمیں جو تصورِ ملت جلوہ افروز نظر آتا ہے وہ صرف اور صرف اسلامی تصور ہے' جس کے مطابق مسلم ملت کی اساس دیگر اقوام کی اساس سے مختلف ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اقبال کا تصورِ ملت نسل پرستی اور تنگ نظری سے بالاتر ہے۔ وطن پرستی اس حد تک کہ مادہ پرستی ہو جائے' اقبال کے ہاں قابلِ قبول نہیں' کیونکہ یہ جذبہ آدمی کو نیچے ہی لے کر جاتا ہے' جبکہ اقبال ہر مقام پر انسان کے لئے اعلیٰ و ارفع مقام تجویز کرتے ہیں۔ یہ بات ان کے تصورِ ملت کی بھی بنیاد ہے۔

© rasailojaraid.com

تصورِ شاہین

اقبال کی شاعری میں جن تصورات نے بلند مقام حاصل کیا ہے' ان میں شاہین کا تصور خاص اہمیت کا حامل ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اقبال کی جو شاعری ملتی ہے وہ حب الوطنی اور حسن تحریر کی آئینہ دار تھی۔ یورپ کے سفر کے دوران انہوں نے جن فطری اثرات کو قبول کیا' ان میں نطشے کا فلسفہ قوت و زندگی اہم ہے۔ گو اقبال کا فلسفہ قوت و زندگی نطشے کے تصور کے برعکس ہے' تاہم اقبال کی شاعری اسی طرح فکری منازل طے کرتی ہوئی ایک ایسے مقام پر آ پہنچی جہاں ان کے ذہن میں شاہین کا تصور ابھرا' جس کا حوصلہ اس کی اُڑان کی طرح مضبوط اور مستحکم ہے۔ ؎

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

دراصل علامہ اقبال نے شاہین کو علامت کے طور پر اپنایا ہے اور ایک مسلم نوجوان کو شاہین کا درجہ دیا ہے۔ اقبال کا شاہین ایک ایسا نوجوان ہے جو مضبوط ارادے' بلند ہمت اور سخت مشقت کا عادی ہے۔ اقبال کا نوجوان شاہین کے روپ میں جن فضاؤں میں محو پرواز ہے وہ مغربی تصورات کی پہنچ سے دور ہیں۔ بقول اقبال ؏

کرگس کا جہاں اور ہے' شاہیں کا جہاں اور!

اقبال نے جب شاہین کا تصور اپنایا تو شاہین کی فطرت کو درویشی' قلندری' خودداری اور

© rasailojaraid.com

بے نیازی کی اعلیٰ صفات کا رنگ دیا۔ ؎

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ!

علامہ اقبال شاہین کو جرأت مند اور چست و چالاک نوجوان کے روپ میں پیش کرتے ہوئے اس کی ایک خصوصیت بتاتے ہیں ؎

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ!

اقبال کا تصورِ خودی

اقبال کے ہاں خودی احساس ذات کا نام ہے، جس کا مطلب ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو پہچانے اور انہیں استعمال میں لاتے ہوئے انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے وقف کر دے۔ گویا خودی سے مراد اپنی ذات اور صلاحیتوں کو پہچانتے ہوئے انہیں اجاگر کرنا ہے۔

علامہ کے نزدیک جذبۂ خودی پوری انسانی زندگی میں جاری و ساری ہے۔ اسی کی بدولت زندگی میں حرارت، تڑپ اور حرکت ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی زندگی، مسلسل حرکت اور عمل پیہم کا محرک خودی ہے۔ اسی لئے انسان ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے اور خودی کی تحقیق و تکمیل کی جستجو کسی مقام پر ختم نہیں ہوتی۔ علامہ اقبال کے ہاں خودی سمندر کی مانند وسعت رکھتی ہے، فرماتے ہیں کہ ؏

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں

اقبال کے نزدیک خودی کی تکمیل کا راز تین مراحل میں پنہاں ہے، یعنی اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں کہ انسان کے مرد کامل بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تین مراحل کو طے کرے اور خود کو پستیوں سے نکال کر ایسی بلندیوں پر لے جائے جہاں خدا بھی اپنی مرضی کو اس کے ارادے پر چھوڑ دے۔ فرمایا ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

© rasailojaraid.

اقبال کہتے ہیں کہ اگر خودی کو مطلق العنان چھوڑ دیا جائے تو یہ شیطانی قوت بن جاتی ہے جس کا کام قتل و غارت اور فساد کے سوا کچھ نہیں۔ ہٹلر اور مسولینی کی صورت میں ہمیں اس کی مثال ملتی ہے۔ لیکن اگر خودی کو کسی ضابطے کا پابند کر دیا جائے اور وہ ضابطہ صرف اور صرف قانون الٰہی ہو تو اقبال کا تصورِ خودی وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے نزدیک خودی کو جلا بخشنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ قانونِ الٰہی کی پابند ہو اور اپنے خالق کی یاد سے غافل نہ ہو۔ کیونکہ ؎

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الاّ اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الاّ اللہ

اقبال کا تصورِ عشق

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکہ، وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اقبال کی شاعری میں عشق کا تصور دوسرے قدیم شعراء سے مختلف ہے۔ اقبال کے ہاں عشق سے عورت اور مرد کی محبت یا وطن کی محبت مُراد نہیں بلکہ ان کے ہاں یہ ایک ایسی لگن اور جذبے کا نام ہے جس کے تحت بڑے سے بڑا مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔ وہ کام جو عقل انسانی میں نہیں آتے یا بظاہر ناممکن نظر آتے ہیں اور جو کام عقل صدیوں نہیں کر پاتی' اقبال کا جذبۂ عشق چند لمحوں میں کر دیتا ہے۔ اقبال کے اس جذبے اور تصور کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ قیام پاکستان جیسا مشکل کام اسی جذبے کے باعث ظہور پذیر ہوا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کربلا کے میدان میں اسلام کی سربلندی کے لئے جذبۂ شہادت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خدا کی مرضی کی خاطر آگ میں کودنا یا جوان بیٹے کو رضائے الٰہی کے لئے ذبح کرنے کو تیار ہو جانا' اقبال کے تصورِ عشق کی بہترین مثالیں ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اقبال کا تصورِ عشق محض رضائے الٰہی اور خوشنودیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبہ پر مبنی ہے اور اقبال کے نزدیک یہ تصور یا جذبہ ہر مسلمان کے دل میں موجزن ہونا ضروری ہے۔ OO

© rasailojaraid.com